ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
Vol. 3, No.1 (2021)
(January to March)

نظریہ پس نو آبادیت، اُردو نظم اور محمد سلیم الرّحمان

Post-Colonial Theory, Urdu Nazam and Muhammad Saleem Ur Rehman

محمد امان اللہ خان

ریسرچ اسکالر، پی ایچ۔ڈی اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract:

Colonialism is strictly referred to the policies and Methods by an Imperial Power maintained and extended its control over the territories or People. A policy of extending a Country's Power and influence through diplomacy or military. It also affects the literature of the Subject Country which is controlled by the colonialist. The Policy or practice of acquiring full or partial Political control over another country, occupying it with settlers and exploiting it economically. A policy of extending a country's power and Influence through Diplomacy or military. Muhammad Saleem Ur Rehman a poet, Translator, Researcher and Critic born on 12 April 1934 at Saharan Pur in India. His Poetry reflects Post- Colonial effects as well as his Criticism and Translation. His book نظمیں، قلبِ ظلمات، جہاں گرد کی واپسی represent much poems, translatory work and research essays about this theory. He has passed much time under the rule of British Government and feel much trouble of thinking due to Colonial system upon the people of Hindustan and Pakistan. This Article Present an analysis of colonial system and its impact on Urdu Poem and also talks about work of a poet Saleem Ur Rehman according to this theory.

Key Words: Post-Colonial, Industrial, Revolution, Imperialism, Colonialism, Imperial Hand Cuffs, impact on Urdu, Saleem -U- Rehman

جب کوئی ریاست اپنی طاقت کے بل بوتے پر کسی کمزور ریاست کے علاقے اور لوگوں کو اپنی عمل داری میں لے کر مقبوضہ ریاست کے قدرتی وسائل اور وہاں کے افرادی قوت کو اپنے اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے فروغ کے لیے استعمال کرے تو مغلوب ریاست غالب ریاست کی نو آبادی کہلاتی ہے۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ نو آبادیاتی نظام ایک ایسا نظام ہے جس میں طاقت ور ریاست اور قوم کسی کمزور ریاست اور قوم کو اپنے مفاد کی خاطر اپنے قبضے میں لے لیتی ہے۔ قابض ریاست کا غلبہ مقبوضہ ریاست کے تمام تر قدرتی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی وسائل کے ساتھ ساتھ افرادی قوت اور تجارتی منڈیوں پر بھی ہوتا ہے۔اسی غلبہ کی بنا پر قابض ریاست اپنی اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی کو فروغ دیتی ہے۔نہ صرف اقتصادی و معاشرتی شعبے بل کہ حکومتی انتظام چلانے والے تمام ادارے بھی قابض ریاست کے دائرہ اختیار میں

آجاتے ہیں۔یوں قابض ریاست اپنی اس نو آبادی پر مکمل اختیار حاصل کر لیتی ہے۔ مزید یہ کہ اس اختیار کو بر قرار رکھنے کے لیے فوجی طاقت کا بھی بھرپور استعمال کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ قابض ریاست اپنی نو آبادی کے مقابلے میں معاشی، معاشرتی، اقتصادی مجموعی اعتبار سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حربی اور سائنسی حوالے سے بھی فوقیت رکھتی ہے۔ قابض ریاست اپنی اسی برتری کی بنا پر خود کو مقبوضہ قوم کے مقابلے میں ایک بہتر قوم اور نسل شمار کرتی ہے اور یہی احساسِ تفاخر ہی اس غالب قوم کے عزائم کو مزید تقویت دینے کے ساتھ مہمیز بھی دیتا ہے اور وہ دوسری اقوام کو اپنے زیر نگیں کرنے اور ان کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کو اپنا حق سمجھنے کا احساس پیدا کرتا ہے۔

نو آبادیاتی نظام ایک اصطلاح ہے جو یورپی اقوام کی دیگر کمزور اقوام پر سیاسی گرفت اور ان کے وسائل پر قابض ہونے کے طریقہ کار کے لیے مستعمل ہے۔ یورپی نو آبادیاتی نظام نے باقاعدہ طور پر سولہویں صدی عیسوی میں اپنا وجود قائم کرنا شروع کیا اور اٹھارویں صدی عیسوی تک اس استعماری نظام نے تشکیل پا کر اپنی جڑیں مضبوط کیں، جب کہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں برطانوی قوم نے دنیا کی مختلف کمزور اقوام کو اپنے تسلط میں لے کر نہ صرف اپنی نو آبادیاں بنایا بل کہ ایک مربوط اور منظم نو آبادیاتی نظام کی بنیاد رکھ کر دنیا کے تقریباً پچیس فی صد حصہ کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔

اردو انگلش ڈکشنری کے مطابق لفظ Colonialism کے مفاہیم کچھ یوں ہیں:

> "The Policy or practice of acquiring full or partial Political control over another country, occupying it with settlers and exploiting it economically."(۱)

ترجمہ: کسی بھی ملک پر کسی دوسرے طاقتور ملک کا سیاسی طرز کا کنٹرول (چاہے وہ جزوی ہو یا مکمل) نو آبادیاتی نظام کہلاتا ہے جو کہ آباد کار کو معاشی و اقتصادی فائدہ دیتا ہے، اگرچہ اس مقبوضہ ریاست کا استحصال ہی کیوں نہ ہو۔

فیروز اللغات کے مطابق سامراج "نو آبادیات اور ماتحت سلطنتیں رکھنے کی پالیسی"(۲) ہے۔ اسی طرح نو آبادی "نیا آباد کیا ہوا علاقہ، کالونی، مقبوضہ علاقہ"(۳) ہے۔ نو آبادیات کا لفظ نو آبادی کا اسم جمع ہے جس کے لغوی معنی نئی آبادی یا نئی کالونی۔ کالونی کا لفظ بنیادی طور پر لاطینی اصطلاح Colonia سے نکلا ہے جس کے مفہوم میں کچھ منظم افراد کا کسی دوسری انسانی آبادی کو یرغمال بنا کر اس کے استحصال کے لیے اپنی نئی آبادیاں قائم کرنا شامل ہے۔ اسی وجہ سے یہ لفظ ایک خاص سماجی حالت کا ترجمان ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر اس لفظ کی معنوی حدود کا تعین کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> "یہ انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں برپا ہونے والی صورتِ حال ہے"(۴)

یہ صورتِ حال پیدا کرنے والے افراد نو آباد کار کہلاتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نو آبادیات کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے روم کے لوگوں نے کیا۔ وہ جب بھی کسی علاقے کو فتح کرتے تو اس پر اپنا قبضہ بر قرار رکھنے کے لیے مفتوحہ علاقوں میں اپنی قوم کے افراد پر مشتمل گروہ وہاں بسا

دیتے تھے۔ اس جدید دور میں یہ اصطلاح غیر ملکی تسلط اور قبضے کے لیے مستعمل ہے۔ یورپی اقوام نے جب امریکہ، ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ پر اپنا قبضہ پکا کر لیا تو یورپی اقوام نے رومی لوگوں کی طرح اپنی اقوام کو یہاں نہیں بسایا بل کہ مقامی آبادی کے چند افراد کی مدد سے انتظام وانصرام قائم رکھا۔ اس کی واضح مثال ہندوستان میں دیکھی جاسکتی ہے جہاں پر صرف چالیس ہزار یورپی افراد نے مقامی افراد پر مشتمل دو لاکھ افراد کی فوج بنا کر بیس کروڑ افراد کو اپنا غلام بنائے رکھا۔ نو آبادیاتی تصور کو دو بنیادوں پر پیش کیا گیا۔ وہ دونوں تصورات یہ تھے:

۱۔　ہم بہتر قوم ہیں لہٰذا خدا ہمارے ساتھ ہے۔

۲۔　ہم مہذب اور ترقی یافتہ ہیں اس لیے غلاموں کی اصلاح ہمارا فرض ہے۔(۵)

جیسا کہ Kipling نے اپنی مشہور نظم White Man's Burden میں بھی اس کا واضح اظہار کرتا ہے۔ پس نو آبادیاتی نظریہ تنقید ایک مابعد جدید فکری نظریہ تنقید ہے جو دراصل سامراجیت نو آبادیت اور استعماریت کی تہذیبی و ثقافتی، سیاسی و سماجی، فکری و لسانی، نفسیاتی، معاشی و معاشرتی اور علمی و فنی باقیات کے تجزیے، مزاحمت اور ردّ عمل کو پیش کرتا ہے۔ اس تنقیدی نظریہ کا آغاز دراصل مغربی طرز فکر اور مغربی طریقہ تنقید کے غلبے کو غیر مستحکم کر کے آزادی اظہار کے نقطہ نظر کے پھیلاؤ سے ہوا۔ اس حوالہ سے فرانز فینن نے "افتادگان خاک" اور ایڈورڈ سعید کی کتب "مشرق شناسی" اور "ثقافت اور سامراج" نے اہم کردار ادا کیا اور اس تنقیدی نظریہ کو دنیا کے سامنے لانے میں پیش رو ہونے کا ثبوت دیا انھوں نے واضح کرنے کی کوشش کی کہ کیسے محکوم قوم کے افکار و اظہار کے وسائل غالب قوم کے زیر اثر تبدیل یا مکمل طور پر مسخ ہو جاتے ہیں۔ مزید بر آں فکری مغلوبیت کا اندازہ اس بیان سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ فاتح قوم کا منشا کس طرح مفتوح قوم کے بیانیے میں شامل ہو جاتا ہے۔

پس نو آبادیات کی اصطلاح کو عام طور پر اس کے لفظی معنوں میں ہی مستعمل ہے یعنی سامراج اور استعماریت اور نو آبادیت کے بعد کے دور کو پس نو آبادیاتی دور کہا جائے گا۔ اسی طرح ہر نو آبادیاتی دور کی باقیات کے اثرات کو پس نو آبادیاتی اثرات کا نام دیا جائے گا۔ البتہ اس مفہوم کو مزید جاننے کے لیے ایک بار نو آبادی بننے والے ممالک کے تہذیبی، سیاسی، ثقافتی اور تاریخی مسائل کا مطالعہ از حد ضروری ہے کیونکہ کہ یہ جملہ مسائل فاتح قوم کے تابع ہو کر کئی نسلوں میں منتقل ہو جاتے ہیں، جسے ہم پس نو آبادیاتی اثر کا نام دے چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پس نو آبادیاتی اثر جہاں سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی، تاریخی، علمی و ادبی، نفسیاتی سطح کو متاثر کرتا ہے وہاں یہ ادب کو بھی ضرور متاثر کرتا ہے جب بھی کسی چیز کا اثر از حد پڑھ جائے تو لازمی بات ہے کہ اس کے رد عمل میں مزاحمت کا ہونا ضروری ہے اور یہی مزاحمت ہی ہماری تحقیق اور تنقید کا مدعا ہے اور یہی پس نو آبادیت اسی نو آبادیت اور سامراجیت و استعماریت کا تسلسل ہے جن سے دنیا قریب ستر سال پہلے نبرد آزما ہو چکی ہے۔ کیوں کہ تاریخ کے عمل میں وہ جملہ افراد، آبادیاں، اقوام، ادارے اور ان اداروں، اقوام افراد کی سرگرمیاں بھی شامل ہیں جو نو آبادکار یا مقتدر قوم کے فرامین شاہی سے لے کر نسلی تفاخر میں مبتلا کسی قوم کی سیاسی و تہذیبی اور ثقافتی، معاشی و معاشرتی، علمی و ادبی، فکری و فنی، نفسیاتی اور اقتصادی تدبیروں کا نشانہ بنتی ہیں لہٰذا تاریخی عوامل کو صرف نو آبادکار، سامراج یا استعمار کار کے حوالہ سے پیش کرتا یا صرف محکوم، مفتوح قوم کو لے کر ایک ہی زاویہ تنقید پیش کرنا گمراہ کن ہے۔

پس نو آبادیت نظریہ تنقید تاریخ پیش کرنا گمراہ کن ہے۔ پس نو آبادیت نظریہ تنقید تاریخ کا از سر نو مطالعہ نہیں بلکہ پرانے طریقوں کا عکس ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نو آبادیت، سامراجیت یا استعماریت ایسا تاریخی عہد ہے جو محض یورپی، پرتگالی فرانسیسی اقوام کے ایشیائی، افریقی یا دیگر کمزور ریاستوں پر صرف سیاسی تسلط کا دور نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایشیا و افریقہ کی اقوام نے سیاسی طور پر تو آزادی حاصل کر لی مگر ثقافتی، معاشی و معاشرتی، تہذیبی، فکری و فنی اور علمی و ادبی سطح پر نہیں لہٰذا یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ نظریہ پس نو آبادیت سابقہ نو آبادیوں میں نو آبادکار سامراجی نظام یا استعمار کار کے خلاف مزاحمت جو اس وقت پائی جاتی تھی یا اب بھی پائی جاتی ہے، کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے موجودہ جدید اور سابقہ نو آبادیاتی نظام میں تاریخ اور اقوام کے مستقبل کے حوالہ سے سب سے اہم ترین مسئلہ شناخت کا رہا ہے۔ عدم تشخص اور عدم شناخت کا مسئلہ دراصل ہجرت کے سبب واقع ہوا ہے جہاں لوگ تعلیمی، کاروباری، یا کسی اور سبب ایک مقام سے دوسرے مقام منتقل ہوئے اور اپنا جائے مسکن تبدیل کر لیا اور جدید نو آبادیاتی نظام کو تقویت دینے کا باعث ہوئے۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر ناہید قمر کا یہ بیان قابل غور ہے۔

> "سابقہ نو آبادیوں کے عوام کو لونیل وراثت کا جواب نو آبادکاروں کی زبان میں اپنی تاریخ اور روایات کا اظہار اپنے مقاصد کے تحت لکھ کر دیتے ہیں۔ مقامی رد نو آبادیت مقامی لوگوں پر پس نو آبادیت کے نظریہ کے فکری اثرات کا مظہر ہے اس رویے کے تحت تخلیق کیا گیا سارا ادب پس نو آبادیاتی ہے۔ پس نو آبادیت نو آبادکاروں کے حوالہ سے نو آباد عوام کی مزاحمت اور سامراجی منصوبوں کے خدوخال واضح کرتی ہے، جن میں اپنے غلبے کا جائز قرار دینے کے لیے ایک سے زائد حکمت عملیوں بشمول غیر مفتوحانہ بیانیے کا استعمال کیا گیا۔"(۶)

نظریہ پس نو آبادیت کا ایک اہم ترین موضوع مکان و مقام، مسکن کے ساتھ ساتھ بے مکانی، نقل مکانی، غیر مسکن اور بے مقامیت بھی ہے۔ یہ موضوع نظریہ پس نو آبادیت کے حوالے سے ایک مخصوص تشخص کے بحران اور عدم شناخت کے مسئلہ پر بحث کرتا ہے کیوں کہ فرد کی انفرادی ذات اور شناخت اس کی تشکیل کا بنیادی عنصر اور جزو ہے جب کہ مقامی شخصیت، تہذیب و ثقافت، نسلی تفاخر شعوری اور لاشعوری دونوں اعتبار سے فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں لہٰذا ہجرت کے سبب جنم لینے والی، نقل مکانی، بے مقامیت، یا وطن سے غیر وطن ہونا، ذہنی بے جڑت، ذہنی غلامی یا جبری مشقت جیسے مسائل کو فرد کی ذات اور شعور میں منتقل کرتی ہے۔ اب یہ مسائل بے مقامیت کی آبادکاری کے سبب وجود میں آئیں یا جبری مداخلت کے ذریعے یا پھر باہمی اشتراک سے تاریخی اور تہذیبی و ثقافتی، معاشی و معاشرتی، اقتصادی و نفسیاتی، علمی و ادبی، فکری و فنی اختلافات سے قطع نظر مکان و مقام، مسکن، بے مقامیت، غیر مسکن، وطنیت اور غیر وطنیت، شناخت اور عدم شناخت، انفرادی و اجتماعی تشخص اور عدم تشخص کا مطالعہ سب کا سب پس نو آبادیاتی ادب کا خاصہ ہے جو متبادل شناخت کو بہت حد تک واضح کرتا ہے۔ وہ تمام خلد جو مقام و مکان، مسکن و غیر مسکن، وطن اور غیر وطن کے تجربات سے زبان و ادب میں در آیا اور اس خلد کے سبب تخلیق کردہ سارے کا سارا متن پس نو آبادیاتی ادب کا حصہ ہے اور یہی اسی تحقیق و تنقید کا مقصد ہے۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر ناہید قمر لکھتی ہیں:

> "یہ خلا ان لوگوں کے لیے وجود میں آتا ہے جن کی زبان ایک نئے مقام کے بیانیے کے لیے غیر معیاری معلوم ہوتی ہے یا ان لوگوں کے لیے جن کی زبان کو غلامی اور تہذیبی نفی کے ذریعے بتدریج برباد کر دیا گیا، یا پھر ان لوگوں کے لیے جن کی زبان نو آبادکاروں کی زبان کے

جبری نفاذ کے نتیجے میں متروک قرار پائی۔ پس نو آبادیت کے دیگر موضوعات میں انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر آزادی کی جدوجہد، پس نو آبادیاتی تناظر میں مقامی تہذیبوں پر ثقافتی تصادم و انجذاب کے اثرات، مغربی و مقامی کرداروں کے تقابل کا بیانیہ اقدار کی شکست و ریخت، مہاجرت و جلاوطنی اور مسلمات سے انکار کا ایک مرکزی رویہ بھی شامل ہے۔(۷)

ڈاکٹر ناہید قمر اس حوالے سے مزید لکھتی ہیں:

"نو آبادیاتی نظام میں عوام پر ایک نئی شناخت ان کی رضامندی کے بغیر مسلط ہو جاتی ہے یعنی موجودہ اور آئندہ نسلیں سماج میں اپنے مقام اور شناخت کے ضمن میں پہلے سے جاری تاریخی عمل کی مرہون منت ہوتی ہیں۔　(۸)

"اردو کی فکری روایت کے ارتقا میں غلطی یہ ہوئی کہ اپنے اختیار کردہ رجحانات کو اجتماعی زندگی کے اصل پس منظر سے علاوہ کر کے دیکھا گیا۔ ہماری ادبی روایت میں علی گڑھ سے تاحال ایک پور اسلسلہ ہے۔ ادھورے نامانوس تجربوں کو اپنی ذہنی اور معاشرتی زندگی میں سوچے سمجھے بغیر جذب کرنے کا، سو ضرورت اپنی تاریخ کو از سر نو پڑھنے کی ہے اور اپنے ثقافتی حافظے او رتہذیبی نسیان کے مضمرات پر غور کرنے کی بھی ماضی نئی شناخت میں مزاحم نہیں ہوا او راپنے اجتماعی حافظے سے محرومی کسی بھی ثقافت کی بنیادوں کو استوار نہیں رہنے دیتی۔"(۹)

اسی نقطہ نظر کی تلاش اپنے اردو معاصر ادب میں جاری وساری ہے اور نظریہ پس نو آبادیت ہمارے ادب کے مطالعہ کے لیے ناگزیر ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے ظلم و ستم اور استحصال سے تنگ عوام و محکوم طبقہ نے اپنے نظریات، معاشرے اور ثقافت کو بچانے کے لیے ہمیشہ رد عمل کی تحاریک اور مزاحمت کا سہارا لیا ہے اور ان کے اثر سے آزادی کی منزل کی طرف گامزن ہوئے۔ جہاں یورپی اقوام ترقی اور بیداری، روشن خیالی اور سائنس کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہوئیں وہاں انسانوں کو ذہنی غلامی و پستی اور جبر و استحصال کے نظام سے بھی متعارف کرا گئیں۔ انسانوں کو طبقات میں تقسیم کرنے کے بعد اجارہ داری کرنے کا ڈھنگ اور اسلوب بھی دنیا کو دیتے ہوئے دنیا کو پہلی، دوسری اور تیسری دنیا میں منقسم بھی کر گئیں۔ اس جبر اور استحصال کے خلاف پوری دنیا کے ادباء، محققین، نقاد اپنی رائے دینے پر مجبور ہو گئے۔ پندرھویں صدی سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آج اکیسویں صدی میں فلسطین، عراق، کشمیر، افغانستان اور شام تک کے علاقوں کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے ہے۔

تاریکی، جبر، ناامیدی اور ظلم و ستم کے اس دور میں عوام کے دلوں میں روشنی اور جدوجہد کی شمع روشن رکھنے کے لیے ادیب اور شاعر اپنے حصہ کا کام کرنے میں آج بھی مصروف ہیں جیسا ماضی کے ادباء اور شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو مزاحمت اور رد عمل کے طور پر جب بھی تخلیق ہوا اس کے خالق کو ہمیشہ بھگتنا پڑا۔ گارشیا لوکا، ڈیوڈ گیٹ، بنجمن مولوٹس، فرخی یزدی، محمد رضا عشقی، سارتر، محمود درویش، آندرے مالرو، ناظم حکمت، رومین رولاں، کریم پور شیرازی، مرتضٰی کیوان، حمد بہرنگی، جلال الاحمد، احمد شاملور، علی شریعتی اور پروین

اعتصامی کے ساتھ ساتھ لوشون، اے چھینگ، ماؤدون، لاؤشے، چولی بو، ابراہیم طوقان، رشید سلیم الخوری، محمد علی الحومانی، سمیع القاسم، سلمٰی الخضر، کمال ناصر، جبرا ابراہیم جبرا، توفیق صانع، لیلیٰ خالد، بورس پاسترناک، انا احموتوا، یوتے شنکو اور واز نیکی کے علاوہ برصغیر پاک وہند میں "اکبر الہ آبادی، اقبال، فیض احمد فیض، حسرت، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، حبیب جالب، مجید امجد، شکیب جلالی، ظہیر کاشمیری، احمد مشتاق، جاوید انور، عبد العزیز خالد، ابن انشا، یحیٰ امجد کشور ناہید، مولانا ظفر علی خان، احمد ندیم قاسمی، یوسف ظفر، رئیس امروہی، شورش کاشمیری، ضمیر جعفری، احمد فراز، خاطر غزنوی، شہزاد احمد، نعیم صدیقی، طفیل ہوشیار پوری، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر ناہید قمر اور افتخار عارف جیسے بیسیوں شعرا اور ادباء ہیں جنھوں نے نو آبادیاتی نظام کے پیش کردہ جبر و استحصال کے نظام کے خلاف مزاحمتی اور رد عمل کا ادب تخلیق کیا اور اپنی تخلیقات کے سبب معاشرے میں انقلاب، آزادی فکر اور حریت کے لیے آواز اٹھائی۔ چاہے جتنے بھی انقلاب آئے، صنعتی انقلاب، انقلاب روس، سپین، انقلاب ایران، انقلاب چین یا انقلاب فرانس وغیرہ نے ادب کو خاص شاعری کو ضرور متاثر کیا اور صنف شاعری میں نظم نے اپنے ہونے کا ثبوت دیا چاہے وہ کسی بھی زبان کا حصہ بنی۔

ان انقلابات اور تحاریک آزادی نے اردو شاعری پر حد درجہ اثر ڈالا جو مختلف شعرا کے ہاں موجود ہے۔ اردو کے نظم گو شعرا اس حوالے سے نمایاں ہیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا اسی اثر کو نمایاں طور پر سمجھنے کے لیے ان نظریات کی روشنی میں اردو نظم کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ یہاں تحریک آزادی کشمیر سے منسلک شعرا کا تذکرہ از حد ضروری ہے جنھوں نے مسئلہ کشمیر کو دنیا میں اجاگر کرنے کے لیے اپنی شاعری کا سہارا لیا، ان میں محمد دین فوق، ملا ظاہر غنی، حبہ خاتون، عبد الاحد آزاد اور غلام احمد مہجور نمایاں طور تحریک آزادی کے سرخیل ہیں۔ ذیل میں محمد سلیم الرّحمان کی شاعری کو اس نظریہ کے حوالہ سے پیش کیا جاتا ہے۔

محمد سلیم الرّحمان

نام	محمد سلیم الرّحمان
تاریخ پیدائش	۱۲۔ اپریل ۱۹۳۴ء
جائے پیدائش	سہارن پور انڈیا
زبان	اردو۔ انگریزی
اصناف	شاعری، ترجمہ، تحقیق، تنقید

مطبوعات

۱۔ A book on Ancient Greek writers

۲۔ قلب ظلمات

۳- Translation of German Short Stories

۴۔ جہاں گرد کی واپسی

۵- Hamlet's odyssey

۶۔　مشاہیر ادب، نظمیں، قوسین ٹمپل روڈ لاہور

مستقل پتہ: قاری کالونی، داروغہ والا، باغبان پورہ لاہور

ہندوستان جیسا سرسبز و شاداب اور جغرافیائی لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل خطہ ہمیشہ سے ہی اقوام عالم کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا رہا ہے۔ کبھی غزنویوں نے تو کبھی تاتاریوں کے ہاتھوں لٹا تو کبھی لودھی، خلجی، غلاماں او رمغل حکمرانوں نے اس کو اپنا پایہ سلطنت بنایا تو کبھی سات سمندر پار سے آنے والی انگریز قوم نے استعماریت نو آبادیت، سامراجیت کے نوکیلے پنجے گاڑے۔ اس سب میں سے اکثر کے پیچھے یہاں کی معیشت اور معاشی مقاصد کا نظام کار فرما نظر آتا ہے۔ ہر آنے والے قابض اور غاصب حکمران نے یہاں کے لوگوں کو خوشحالی کے سبز باغ دکھائے اور عوام کی فلاح و بہبود کے نام پہ ایسی ایسی پالیسیاں بنائیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے تمام تر وسائل ہونے کے باوجود دوسرے کے محتاج بن گئے اور آج تک بعد از تقسیم ستر سال گزر جانے کے باوجود بھی اسی نو آبادیت کا راج ہے اور حالات جوں کے توں ہی ہیں۔ تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ہندوستان جب ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد جب مغل دور میں تاریخ داخل ہوتی ہے تو ایک طرف درباری نظام حکومت کی رفعت و عظمت کی بنیادیں کھوکھلا شروع ہو گئی تھیں تو دوسری طرف استعماریت، سامراجیت، اور نو آبادیت نے اپنے قدم مضبوط کرنا شروع کر دیئے۔

مزید بر آں تجارت کی غرض سے آنے والے لوگوں دیکھتے دیکھتے یہاں کی عوام کے دل و دماغ پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور بالآخر دل و دماغ اپنے قبضہ میں کر لیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اپنے لوگوں اور حکمرانوں سے بیزار ہوتے چلے گئے۔ یہ بیزاری اچانک سے نہیں ہو گئی بلکہ اس کے پیچھے وہ تمام استعماری پالیسیاں ہیں جن کا اطلاع آج تک جاری و ساری ہے یہی تو پس نو آبادیت ہے۔ اس سارے عمل سے جہاں دیگر اصناف متاثر ہوئیں وہاں اردو زبان و ادب بھی کافی حد تک متاثر ہو گئے۔ اس نو آبادیاتی دور کے پیدا شدہ افراد میں جہاں استعماریت کے حامی لوگ پیدا ہوئے وہاں اس کی مزاحمت میں لکھنے والے لوگ بھی شامل تھے ان میں ایک نام محمد سلیم الرحمن کا بھی ہے تقسیم ہند کے بعد اپنے آبائی وطن سہارن پور سے ہجرت کر کے لاہور کو اپنی جائے مسکن بنایا۔ مختلف ادبی رسائل سے وابستگی بھی اختیار کی اور اپنا ایک ادارہ قوسین کے نام سے بھی بنایا جو دراصل پبلشنگ کا کام انجام دیتا ہے۔ ادبی رسالہ "سویرا" سے وابستہ ہیں۔ محمد سلیم الرحمن اگرچہ کم ہی نظمیں لکھتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ اردو میں ان کے لیے نظم لکھنا مشکل ہے وہ خود بتاتے ہیں کہ ان کی نظموں کی تفہیم مشکل ہو گی کیوں کہ انھوں نے نظم لکھنے کا طریقہ انگریزی اور یورپی ادب سے سیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں شعری روایات سے پوری طرح جڑی ہوئی نہیں ہیں۔ کبھی کبھی انگریزی میں نظمیں لکھتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ استعماری پالیسیاں آج تک جاری و ساری ہیں اور اس سے اردو ادب بھی بچ نہ سکا انھی اثرات کو آج کی جدید نظم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور اسی پس نو آبادیاتی اثرات کو محمد سلیم الرحمن کی نظم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان کی اکثر نظمیں بلا عنوان ہیں چند ایک بعنوان بھی ہیں۔

آج کا کام کل پر چھوڑنے والوں کے نام

۔۔ہم ظلم کا رونا روتے ہیں گھر گھر جا کر
اور گھر آ کر

ظالم سے ہمیں کچھ کہتے ہوئے رہتا ہے بہت
جھگڑے کا ڈر
ہم مظلوموں کا ہاتھ پکڑنے سے اتنا
کیوں ڈرتے ہیں؟۔۔۔ (۱۰)

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ استعماریت کی وہ پالیسیاں جن کو بروئے کار لاتے ہوئے سامراج، نو آبادکار اور استعمار کار نے ہندوستان بل کہ تقسیم کے بعد موجودہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی اقوام کو نہ صرف ذہنی غلامی کی طرف دھکیلا بل کہ اس ذہنی غلامی کے سبب جو ظلم و ستم روا رکھے گئے خاص پاکستان اور مسلمان قوم کے حوالے سے اس نے تخلیقی ادب پر اپنے دور رس اثرات مرتب کیے۔ موجودہ دور جس کو ہم جدید نو آبادیاتی ڈھانچے یا نظام کے تحت دیکھیں تو پوری دنیا میں ذلت کی پستیوں میں اگر کوئی قوم زندگی گزار رہی ہے وہ مسلمان قوم ہے۔ اس قوم کی ذلت کی ان پستیوں میں دھکیلنے کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد ہے کہ ان سے ان کی شناخت چھین لی جائے۔ ان کی تہذیب و ثقافت، علم و فن، فکر و نظر، سماج و روایات سب کی سب تو جدید سامراجی نظام نیو ورلڈ آرڈر یا one World order کے تابع کرنے کی کاوش جاری و ساری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کا نو آبادکار ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا جو حقیقی معنوں میں ان آبادکاروں کو نہ صرف ذہنی طور پر قبول کر چکا تھا بل کہ ان کے نظریات، پالیسیوں کے معاشرے میں نفاذ کی راہ ہموار کرتا اور آج ان نو آبادکاروں کے وہ نظریات اور پالیسیاں من و عن عمل در آمد ہیں۔ اس جدید دور میں نو آبادیاتی دور کے اثرات کا مطالعہ اور ان اثرات کا ادبی صورت حال سے ربط بھی صرف اسی لیے ہے تا کہ لوگوں کے ذہنی رجحانات کو سمجھا جا سکے۔

New World Order کے تحت جو نظام تشکیل دیا جا رہا ہے اس کے تحت لوگوں یا اقوام سے ان کی شناخت چھین کر ان کو ایک مخصوص شناخت دیتا ہے اور ایسا نظام قائم کرتا ہے جس کے تحت پوری دنیا ایک نظام کے تابع ہو۔ جب کسی سے شناخت چھیننے کا عمل شروع ہو جائے تو لازمی بات ہے کہ اس کے خلاف مزاحمت تو ہو گی اور اس مزاحمت کو ادب کے سبب وسیع پیمانے پر پیش کیا جا سکتا ہے جسے ہم پس نو آبادیاتی اثر کے ذیل میں دیکھ چکے ہیں۔ محمد سلیم الرحمن نے اپنی نظم میں اسی کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اور اپنا مدعا بیان کیا ہے۔

اردو نظم کی جو روایت تقسیم ہند سے شروع ہوئی اس کی نمائندگی ن۔ م راشد، میراجی اور مجید امجد نے کی۔ اس نظم کا عمومی موضوع انسان اور انسانیت تھا اور اس کی پہچان کے حوالے سے اس کے خارجی ماحول سے وابستہ تھے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کی شاعری میں خارجیت کا عنصر زیادہ ہے۔ البتہ اس دور کی نظم میں انسان کی شناخت اور عدم تکمیل کا ایک گہرا احساس ضرور پایا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء تقسیم ہند کے بعد کی اردو نظم میں جو رجحانات در آئے وہ فکری اور لسانی اعتبار سے اہمیت کے حامل تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ نظم انسانی تجربے اور واردات قلبی و خارجی ہر دو لحاظ سے متاثر تھی قیام پاکستان کے وقت تخلیق پانے والی اردو نظم رومان اور احتجاج کا مرقع تھی اور یہ رجحانات اردو نظم کی سرشت میں بہت گہرے تھے۔ اس جدید نظم نے انسان کے داخلی صورت حال اور خارج کے مابین مکالمے کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اس مکالمے کے سبب اردو نظم کے وجود میں نئے نئے استعارات، تلازمات اور علامتی معنویت کے حامل امکانات در آئے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی کے شعرا نے اپنی تخلیقات کے سبب اردو نظم میں انسان کے معاشرتی اور تمدنی تصور کو نامکمل قرار دیتے ہوئے زندگی کے منہدم کو محدود زاویہ نظر سے الگ کرتے ہوئے تصور کائنات سے مربوط کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی دور کی اردو نظم نے لسانی پیکر

دریافت کیا اور یوں شعری تجربے کی تکمیل، نئے لسانی مظاہر کی دریافت اور لفظ و معنی کی نئی سطحوں پر تشکیل ہوئی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ لسانی تشکیلات کا یہ رجحان قائم بالذات نہ ہونے کے سبب اردو نظم کو تقویت نہ سکا۔ وہ شعرا بھی اس روایت میں شامل ہوئے جن کا تہذیبی تناظر شہری زندگی اور اس کے مسائل سے عبارت ہے اور ان شعرا کے ہاں یہ تجربہ وجودیت پسندی کے نظریہ کو تقویت دیتا ہے۔ بعض ایسے شعرا بھی ہیں جن کے ذہنی سفر میں کہیں نہ کہیں دیہاتی یا قصباتی زندگی اور زمین و فطرت سے گہرے انسلاک کے تحت زندگی اور بیگانگی کے سوالات صوفیانہ جہت کے حامل بھی نظر آتے ہیں۔ محمد سلیم الرّحمان کا تعلق اس دوسری قسم کے شعرا سے ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ناہید قمر لکھتی ہیں:

> "محمد سلیم الرحمن کے تخلیقی شعور کی ایک امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اپنے مرکز سے علاحدہ ہوئے بغیر اور اپنے مقام کو چھوڑے بغیر ایک ایسے تہذیبی مسئلے کی نشاندہی کر سکتا ہے جو رفتہ رفتہ عالمگیر بنتا ہے۔ ہمارا اجتماعی وجدان، ہمارا تاریخی شعور، ہر حقیقت کی طرف ہمارا رویہ غرض یہ کہ اس شاعر میں زندگی کے تمام تجربوں کو ایک عالمگیر سچائی منتقل کر دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ان کے ہاں انفرادیت کا احساس بہت شدید ہے اور اس احساس کو بنیاد فراہم کرنے والی اصل حقیقت ان کی اپنی تہذیبی شناخت کا تصور ہے اور یہی وہ پس منظر ہے جس میں ان کی نظمیں اپنے عہد کی سیاسی، روحانی اور ادبی اقدار متعین کرتے ہوئے اپنی معنویت ہم پر واضح کرتی ہیں۔"(۱۱)

محمد سلیم الرّحمان ان چند شعرا میں سے ایک ہیں جن کے ہاں لفظیات کا دائرہ کار بہت زیادہ وسیع ہے اور مزید برآں ان کے ہاں نظم کے موضوعات خیال اور بیان کی ندرت اور احساس کی یکسوئی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی نظم میں ہندی، پنجابی کے مانوس الفاظ کو بڑے ہی احسن انداز میں برتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انھوں نے ایک نئے شعری لحن کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اپر سپار، اوالا نشوں، مصاف، گھمر، بابنی، شائگان، اڑاٹا، پر قینچ، کربائی، وساسول، سمنکھ، غرفش، اگھوری، مرفوع اور القط جیسے الفاظ کا استعمال رچی بسی بو باس کی یکسانیت اور ان الفاظ کے نئے پن کا احساس مفہوم میں رکاوٹ ضرور دیتا ہے۔ ان الفاظ کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ ان کی شاعری کے تراکیبی نظام کو سمجھا جائے کہ وہ اپنی فکری پیچیدگی کو کس قدر سادگی سے بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں اور بڑی آسانی سے یہ نادر نایاب تراکیب خلق کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ نیلمبر پورب، خیرگی کا گرداب، زخار فرسخ، نندا سی، مسافت، ارغوانی، بیاباں، ناشنیدہ اثبات، شایگان پت جھڑ، زائچوں کا کرب، اور سرمائی حضوری جیسی منفرد تراکیب ان کی نظموں میں جابجا بکھری پڑی ہیں جو دراصل سلیم الرّحمان کے لسانی رویے پر دال ہیں۔ ان کے شاعرانہ نظام اور تخلیقی تجربات کو جب تنقید کی سل سے گزارا گیا تو جو حقیقت واشگاف ہوتی ہے وہ ذیل کا بیان واضح کرتا ہے۔

> "کسی تخلیقی فنکار کی انفرادیت اس وقت سامنے آتی ہے جب وہ دوسروں کے دیکھے ہوئے خوابوں میں اپنے خوابوں کو گڈمڈ نہیں ہونے دیتا۔ جس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ زندگی کی طے شدہ اقدار اور ان کے سرچشموں سے بعض اوقات کچھ ایسے دائرے اور نظام بھی وجود میں آتے ہیں جو اپنی الگ شناخت کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہر زمانے اور عہد کی اپنی روح ہوتی ہے جس کی تفہیم کے ذریعے تخلیق کار کی آواز اس کے عہد کی

روح سے منسلک اور فیض یاب نظر آتی ہے اور کسی شاعر کا آہنگ جب اس کے عہد اور پوری شعری روایت کے آہنگ سے ملتا ہے تو بڑا ادب وجود میں آتا ہے اس اعتبار سے محمد سلیم الرحمن کی نظمیں معاصر ادب اور عہد کے درمیان اس پل کی حیثیت رکھتی ہیں جس کے ذریعے فرد کے باطن سے معاشرے تک اور معاشرے سے نکل کر انسانی نفسیات کے داخلی منطقوں تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔"(۱۲)

نظریہ پس نو آبادیت کا حوالہ سے ان کے Vision کو جس انداز میں پرکھا گیا ہے اس کے لیے درج ذیل بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

"نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد ادب میں "Self" کا تصور، تشخص کا بحران، کے نتیجے میں ہجرت اور جلاوطنی ایک نفسیاتی واردات کے علاوہ ایک طرز احساس کے طور پر بھی ہمارے ادب کا ایک بڑا استعارہ بن گئی۔ یہ استعارہ انسان اور اشیاء کی اپنے اپنے مقام سے ہجرت سے وجود میں آنے والی ذہنی بے جڑی کے اہم مسئلے کی طرف نشاندہی کرتا ہے، جس نے وطن میں رہتے ہوئے بے وطنی کے احساس کو تحریک دی۔ کسی آدرش یا جبر کے تحت ہجرت کرنے والے روحانی جلاوطنی کا شکار ہونے کے باوجود کسی شدید جذباتی بحران کی زد میں نہیں آتے۔ لیکن دور جدید میں بدلتے ہوئے طرز حیات کے تقاضوں کے تحت مضافات سے بڑے شہروں کی طرف ہجرت کرنے والے اس بے فیض جذباتی بحران کا شکار ہوئے۔ محمد سلیم الرّحمان کی نظموں میں خواب، نیند اور موت کے تلازمات میں یاد اور فراموشی کی بنت سے شاعر اپنی شناخت کا سرا تلاش کرنے کی جستجو کرتا ہے اور قاری کو احساس دلاتا ہے کہ محض شاعر کا نہیں، ایک پوری نسل کا اجتماعی ماضی ہے اور محمد سلیم الرّحمان کی نظمیں اس اجتماعی حافظے کی تحفیظ، امریکی شاعر ڈونلڈ ہال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے جلاوطنی کی زندگی گزار کر وطن واپس آئے اضطراب اور تسلی سے بھرپور جلاوطنی، ایک گھر جسے چھوڑا جائے اور پھر اس میں واپس آیا جائے۔ محمد سلیم الرّحمان کی شاعری ان دونوں تجربات کے بین بین ظہور کرتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ذہنی ہجرت یا جلاوطنی مادی اور روحانی دونوں مفاہیم لیے ہوئے ہے۔ ایک ایسا صوفیانہ مراقبہ یا سفر کی علامت جو خیال کی مختلف سطحوں سے ہوتا ہوا شعور کے مرکزے تک جاتا ہے۔ شاعر خود کو اس انبوہ کا ایک حصہ سمجھنے کے ساتھ ساتھ جو صدیوں سے بے سمت چل رہا ہے شعوری سطح پر اس سے الگ بھی سمجھتا ہے۔ روحانی ترفع اور بصیرت کے اس مقام پر جہاں وقت کے حصار سے نکل کر کسی ابدی سچائی کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے"۔ (۱۳)

درج بالا بیان اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ محمد سلیم الرّحمان کی نظمیں نظریہ پس نو آبادیت کے ذیل میں لکھی گئی اور ان اثرات کو واضح کرتی ہیں۔

قیدِ مکرر

کتنے سبق اب یاد نہیں ہیں
رفتہ رفتہ سارے در دیوار ہوئے ہیں
شاید ہم آزاد نہیں ہیں
یاد کے جو قیدی تھے پہلے
اب نسیان کے زنداں سے دوچار ہوئے ہیں　　(۱۴)

حوالہ جات:

1. http//www.google.com/Urdu English Dictionary/ Colonialism.P1

۲۔ فیروز اللغات، اردو، جامع، ایڈیشن ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۴۹

۳۔ ایضاً

۴۔ نیر، ناصر عباس، ڈاکٹر، "نو آبادیاتی صورت حال"، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الحسن، لاہور، کلیہ علوم شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، ص ۶۴ تا ۶۵

۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، "برطانوی ہندوستان"، لاہور، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰ تا ۱۱

۶۔ ناہید قمر، ڈاکٹر "اردو ادب میں تاریخیت" اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۷ء، ص ۷۷ تا ۷۸

۷۔ ایضاً، ص ۷۹

۸۔ ایضاً، ص ۸۳

۹۔ ایضاً

۱۰۔ محمد سلیم الرحمن، "نظمیں" لاہور، قوسین ٹمپل روڈ لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۹۲ تا ۹۳

۱۱۔ ناہید قمر، ڈاکٹر "اردو ادب میں تاریخیت" اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۷ء، ص ۸۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۹۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۹۳ تا ۹۴

۱۴۔ محمد سلیم الرحمن، "نظمیں" لاہور، قوسین ٹمپل روڈ لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۱۳۹